مدرسہ سلطانیہ کے محرک ومرغب

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید حسین صاحب علیین مکانؒ

فاضل نبیل چودھری سید سبط محمد نقوی صاحب طاب ثراہ

آصف الدولہ کا آخری دور اور جناب غفرانمآبؒ کی کہولت تھی کہ ۱۴ ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ میں آپ کی ولادت ہوئی تو آپ بہ اعتبار جامعیت سرآمد تلامذہ اور آپ کے الطاف بے پایاں کے مورد خصوصی مفتی علامہ میر عباس (م ۱۳۰۶ھ) نے 'مطلع شمس العلماء الشرع' (۱۲۱۱ھ) میں ہمزہ ساقط کر کے تاریخ ولادت تلاش کی ہے۔ مفتی صاحب جناب سید العلماء کے سب سے اہم ستائش گر تھے اور جناب کے فضائل وکمالات کے نشر میں آپ نے جس انہماک وشغف کا اظہار کیا ہے وہ اپنی آپ مثال ہے آپ نے جناب کے جس شرف کا بکثرت ذکر کیا ہے وہ حضرت سید الشہداء کے ساتھ ہم نامی کا شرف ہے۔ چند مقامات آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

پرستار ہر خستۂ مبتلا
سمی جگر تشنۂ کربلا
کہ ازو سر بلند نام خدا
بود ہمنام سید الشہداؑ
رفت از دنیا سمی خامس آل عبا
سایۂ رحمت ز فرق اہل دیں برداشتند
اَعْنِیْ مُسَمّٰی ابْنِ الْبَتُولِ علیہ السلام الطاھرہ
اَضْحٰی بِطَفِّ الْکَرْبلاءِ اُسْتُشْھِدَ

اَللّٰہُ نَاصِرُہٗ وَاَحْمَدُ جَدُّہٗ
اَبُوْہُ حَیْدرُ وَالْحُسَیْنُ علیہ السلام اِسْمُہٗ
عَلَّامٌ حِبْرٌ فَقِیْہٌ کَامِلٌ
سَالِکٌ سَامٍ سَمِیٌّ لِلْحُسَیْنِ علیہ السلام

اس شرف پر بار بار زور دینا نہ بے وجہ تھا اور نہ کوئی اتفاقی بات بلکہ اس کے پس پشت جناب کی وجہ تسمیہ تھی۔ اس سلسلہ میں مفتی علامہؒ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

"میں نے ثقہ حضرات سے سنا ہے کہ جب آپ سے بڑے بھائی، آپ کے دوسرے برداران بزرگ کے بعد متولد ہوئے، تو ان کا نام سید مہدیؒ رکھا گیا۔ تب خواب میں آپ کے پدر علامہ غفران مآبؒ نے حضرت سید الشہداءؑ کو دیکھا کہ دریافت فرماتے ہیں کہ وہ ترتیب اسماء کیوں ترک کر دی جس کی رعایت شروع میں ملحوظ رکھی گئی تھی۔ عرض کی میرا یہ بیٹا میرے کبیر السن ہو جانے کے بعد پیدا ہوا اور مجھے خیال ہوا کہ اب اور فرزند نہ ہوگا اس لئے اسے آپ کے فرزند آخر کے نام سے موسوم کر دیا۔ ارشاد ہوا کہ یہ گمان صحیح نہیں ہے۔ ابھی ایک فرزند کی اور پیدا ہوگا جب اس کی

ولادت ہوتو ہمارے نام پر اس کا نام رکھنا۔ اس طرح امام علیہ السلام کی بشارت سے آپ کی ولادت اور ہدایت پر تسمیہ ہوا۔ اور اس میں آپ کی فضیلت کی ایسی دلیل موجود ہے جس سے بڑی اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔'' مفتی صاحب مرحوم نے فرمایا کہ اس سے بڑی اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی اور یہ حقیقت بھی ہے لیکن جذبۂ سپاس گزاری اور رتبہ شناسی کو تسکین نہیں ہوئی۔ آپ کے اسم گرامی سے پہلے جو القاب و اوصاف قلمبند کئے ہیں، وہ دو چار سطر کم تین صفحات پر محیط ہیں افسوس کہ مختصر مضمون میں ان کے نقل کی گنجائش نہیں۔

آپ کی بسم اللہ خوانی اور مکتبی تعلیم کا الگ سے کوئی ذکر نہیں ملتا۔ غالباً علی اور محمد بھی پدر بزرگوار جناب سید دلدار علی غفران مآبؒ اور جناب سید محمد صاحب سلطان العلماء اور برادر بزرگ ترین کے علاوہ غیر کے سامنے حسین کا زانوئے تلمذ تہہ کرنا گوارا نہ کیا گیا ہو۔

تذکرۃ العلماء میں مقدس لوذعی مولوی سید محمد مہدیؒ فرماتے ہیں:

''آن جناب بہ خدمت والد بزرگوار خود وہم بخدمت برادر نامدار خود جناب سلطان العلماء الاوحد الامجد سید محمد دام ظلہ العالی استفادہ علوم نمود۔''

سترہ سال کی قلیل مدت میں تکمیل تحصیل کر کے نہ صرف رتبہ اجتہاد پر فائز ہو چکے تھے ''تجزی فی الاجتہاد'' میں ایک رسالہ کی تصنیف بھی شروع فرمائی اور اس کے بعد حکم ''ظن رکعتین اولین'' نامی رسالہ بھی قلم بند فرمایا۔ لیکن فرطِ حیا و حجاب سے کسی کو اس کی خبر نہ ہونے دی۔ لیکن اپنے بڑے بھائی جناب سید مہدیؒ سے جو سن میں صرف تین سال بڑے تھے اس سلسلے میں تبادلہ خیال ہوتا رہتا۔ آپ جو تحریر فرماتے وہ موصوف کے ملاحظہ سے گزارتے اور جو لکھتے آپ کو دکھاتے۔ یہاں تک کہ ایک روز جناب غفران مآب نے ہدایت فرمائی کہ اپنے لئے اجازے کی یاد دہانی کردیں۔ عرض کی کہ میرے قلم سے جو کچھ نکلا ہے پہلے اسے ملاحظہ فرمالیں اور میری تحریر اگر مناسب طرز اسلوب میں ہو تو مطلع فرمایا جاؤں۔ بہرحال خواہش یہی ہے کہ اس کے حسن و قبح سے مطلع کیا جاؤں۔'' یہ عرضداشت قبول ہوئی اور سید العلماء کو ہدایت ہوئی کہ رسالہ سنائیں۔ ابھی سماعت بھی پوری نہ ہو سکی تھی کہ حضرت غفران مآبؒ نے تحسین فرمائی کہ یہ متانت، طرز تحریر اور اسلوب تقریر نو کار کا نہیں پختہ کار کا معلوم ہوتا ہے۔ مگر سوء مزاج کے باعث پورا رسالہ جناب غفران مآبؒ کی سماعت سے نہ گذر سکا۔ یہ خدمت جناب رضوان مآبؒ کے سپرد ہوئی کہ وہ رسالہ ملاحظہ فرما کر اس کی کیفیت جناب غفران مآبؒ سے عرض کریں۔ جناب رضوان مآب نے تعمیل ارشاد کی لیکن چونکہ سید العلماء اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اس لئے پسند نہیں فرمایا کہ ان کے تجّر و جودت و لیاقت کی کیفیت منظر عام پر آئے۔

ورثۃ الانبیاء میں مولوی سید احمد علامۂ ہندی کا کہنا ہے کہ

''احقر الحمد للہ تجزی مذکور بخط حجۃ الاسلام

اعلم الناس مفتی میر عباس مرحوم پیش خود دارد'

معلوم نہیں کہ وہ نسخہ اب کہاں اور کس حال میں ہے۔

سطور بالا میں جو کچھ عرض ہوا ہے وہ ورثۃ الانبیاء کے وسیلے سے تذکرۃ العلماء سے مستفاد ہے۔ تاہم تعلیم کا ذکر تمام کرنے سے پہلے مصنف کے بیان کا ایک حصہ عیون الفاظ میں دیکھ لینا مناسب ہے۔ لکھتے ہیں:

''...... می فرمایند کہ من در ابتدائے تحصیل وہم در منتہائے آں بخدمت جناب غفران مآب والد ماجد خود قرأت علوم نمودم و در آن اثنا بعض علل واسقام عارض حال آں جناب شد کہ بسبب آں: در آں ایام از افادہ درس مرا بر جناب اکمل، اجل، قدوۃ الفقہاء، اسوۃ المجتہدین، عمدۃ العلماء وزبدۃ المتکلمین اخی معظم مجد اوحد جناب سید محمد ادام اللہ افادتہ وایدہ بتائیدہ وافاض علی البریۃ من برکاتہ محول فرمودہ پس مدتے طویل در خدمت آں جناب بہ تحصیل علم معانی وبیان از علوم عربیہ وبعض علوم حکمیہ وفنون رسمیہ وبرخے از علوم دینیہ اشتغال داشتم...... پس بعد از انکہ جناب غفران مآبؒ علامہ آفاق والد ماجدم علیہ الرحمہ از مرض افاقہ یافت درس من بخد متش عود نمود......''

تکمیل تحصیل کے بعد جناب غفران مآبؒ سے براہ راست بھی اور جناب رضوان مآب کے واسطہ سے بھی اجازہ ملا۔ یہ عبارت اس نتیجہ پر پہنچنے میں مددگار ہے کہ پدر وبرادر کے سوا جناب مرحوم نے کسی منزل وسطح پر تحصیل علم نہیں کی۔

ہمارے اسلاف عظام کے طرز سیرت نگاری میں محض ذکر فضائل بھی سمجھا جاتا تھا، تقلید زمانی کا رواج نہ تھا۔ اس لئے ٹھیک وقت تعین کرنا تو پیش نظر ماخذ کی مدد سے ممکن نہیں ہے لیکن خود جناب نے اس سلسلے میں جو افادے فرمائے ہیں ان سے کسی حد تک زمانہ معین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۲۳ رجب ۱۲۶۸ھ کی ایک تحریر سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ طلاب کے ساتھ مباحثہ ومدار عنفوان شباب میں شروع ہو گیا تھا اور جناب غفران مآبؒ طاب ثراہ بقید حیات تھے۔ غفران مآبؒ کی رحلت کا المیہ ۱۲۳۵ھ میں پیش آیا جب جناب سید العلماء ۲۴ سال کے تھے۔ ہم یہ معلوم کر چکے ہیں کہ سلسلۂ تصنیف وتالیف ۱۷ سال کی عمر میں شروع ہو چکا تھا، اس لئے یہ قیاس کرنا درست ہوگا کہ سلسلۂ درس کی ابتدا اس کے آس پاس ہوگی کیونکہ ہمارے دیسی نظام تعلیم میں یہ عام بات تھی کہ مافوق طلاب سے ماتحت طلاب کو درس دلایا جاتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر مذاکرہ تھا جس میں سربرآوردہ وممتاز طلبہ اپنے رفقاء درس کی مدد کیا کرتا تھا۔ اس طریقہ تعلیم کو بعد میں انگریزوں نے مانیٹیوریل سسٹم یا مدارس سسٹم کے نام سے موسوم کیا۔

تاریخ تعلیم ہند کے فاضل مصنفین سید نور اللہ، وجے پی نایک کا کہنا ہے کہ

''وہ مخصوص طریقہ تھا جس کے ذریعہ ۱۸۰۱ء

اور ۱۸۵۴ء کے درمیان انگلستان نے بہت کم لاگت سے ابتدائی تعلیم کی اشاعت میں کامیابی حاصل کی۔ اسے قسمت کی ستم ظریفی کہئے کہ ہندوستان کے دیسی اسکول انگلستان میں تعلیم کی ترویج میں اس طرح معاون ثابت ہوئے اور خود یہاں تعلیم عامہ کو پھیلانے میں ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔" (ص۵۵)

مگر محفل درس کی با قاعدہ آراستگی اسی وقت ہوئی جب غفران مآب علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد آپ کی ذاتِ گرامی مرجع قرار پائی۔ خود فرماتے ہیں:

"والداحلہ اللہ دارالکرامہ کی وفات کے بعد افاضل مومنین واماثل دین نے ہر طرف سے میری جانب رجوع کیا اور درس کی وجہ سے استدعا کی لہٰذا اس اشتغال تدریس ومباحثہ کے باعث تصنیف وتالیف سے معذور رہا۔"

اس سے ثابت ہے کہ ۲۴ سال کی عمر میں آپ کی بزم افادہ سج چکی تھی۔ تعلیم عامہ کے ساتھ جناب کو جو دلچسپی تھی اس کا شاندار ثبوت جامعۂ سلطانیہ ہے۔ اس سلسلہ مضامین کی پہلی قسط میں کچھ ذکر ہو چکا ہے کچھ یہاں ملاحظہ کریں۔

۱۲۵۲ھ مطابق ۱۸۴۳ء میں ثریا جاہ خاقان زماں، محمد امجد علی شاہ کا عہد معدلت مہد کیا آیا مملکت اودھ میں حکومت الٰہیہ کی تجلیاں سی نظر آنے لگیں۔ مرزا رجب علی سرور جنھیں مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے لکھنؤ کے شہدوں میں شمار کیا ہے اور ان کے امثال ابن الوقت تاریخ نویس کچھ بھی اڑائیں لیکن انگریزی اثر سے آزاد معتبر مورخوں نے اس دور کو ستائشی الفاظ سے یاد کیا ہے۔ صاحب وزیر نامہ منشی امیر علی نے جنھیں معتبر مورخوں میں شمار کئے جانے کے معقول اسباب ہیں تحریر کیا ہے۔

"......در تاسیس مبانی دین واتباع اوامر ونواہی شریعت حضرت خاتم النبیینؐ قصب السبق از بسا پیشنیاں این سلطنت باعزوشان بردہ ودر کثرت طاعت وعبادت وادخار نقود وخزائن خیر وسعادت بر اکثر سلاطین بافرد تمکین فضلے ومرتبے حاصل کردہ..."

یوں تو ناظم امور شرعیہ اور قاضی القضاۃ کا منصب جناب سلطان العلماء طاب ثراہ کے لئے تھا لیکن صاحب ورثۃ الانبیاء کے بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ

"بادشاہ ...طاب ثراہ نہایت اعتقاد وحسن ارادت بخدمت آں جناب داشتند ودر سائر اموریکہ مجتہد العصر والزمان رضوان مآب، را بہ آں گرامی می داشت اشتراک آں جناب را امر عی می فرمود..."

اس اثر ونفوذ کے ساتھ جو کچھ چاہتے وہ سب ہوتا لیکن جناب نے نائب امامؑ کی شان جلیل کا مظاہرہ کیا اور مدرسۂ سلطانیہ کی شکل میں بادشاہ اور اپنی دونوں کی ایسی یادگار فیض آثار چھوڑی جو نشر معارف اہلبیت علیہم السلام کی خدمت کی ایک صدی پوری کر چکی ہے۔ غصب اودھ کا

واقعہ ہائلہ نہ پیش آ گیا ہوتا تو اس کا عرصہ افاضہ ۱۳۵ رسال کی طویل مدت پر محیط ہوتا۔ فرماں روایان اودھ نے اپنی تاریخ لکھنے یا لکھوانے کی طرف توجہ مبذول نہیں کی۔ انگریزوں کے دور میں جو کچھ لکھا گیا، وہ بیشتر ان کے اشارے سے تھا اور اس میں تمام تر اُنھیں کی ترجمانی ہے اس لئے تاریخ کا دامن اس تصریح سے معرّا ہے کہ مدرسۂ سلطانیہ کی بنا کے اسباب کیا ہوئے۔

ہندوستان کی تاریخ تعلیم کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس وقت کا نظام انگریزی دور کی بہ نسبت زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور سہل الحصول تھا۔ اسے قید حکومت میں دینے کا کوئی جواز بظاہر نظر نہ آتا تھا۔ خود جناب سید العلماء کے سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ جناب صبح کی نماز کے بعد سے لے کر عشاء کے بعد تک تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ مشغول درس رہتے تھے۔ آپ کی ہی نہیں، آپ کے دوسرے ذوالعشیرہ تلامذۂ غفران مآبؒ اور خود آپ کے شاگردوں کی مجالس درس گرم رہتی تھیں۔ پھر فرنگی محل کی بزم درس تھی جہاں علوم عموی کی تحصیل کے مواقع سب ہی کو تھے۔

ان فراواں سہولتوں کے باوصف مدرسۂ سلطانیہ کی تاسیس کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ ایک توخصوصی وفوری داعی ہوا، عہد نصیر الدین حیدر شاہ مرحوم میں انگریزی مدرسہ کا قیام اس کا تفصیلی تذکرہ اس سلسلہ کے پہلے مضمون میں آپ ملاحظہ فرما چکے۔ دوسری وجہ اور اہم وجہ انگریزوں کے روز افزوں تسلط اور اودھ کی آزادی ضائع ہوجانے کا ہمارے دانشور طبقہ میں احساس تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ انگریزوں کے استحصال کے باعث افلاس بڑھ رہا تھا اور اس کے ساتھ مروج نظام تعلیم انحطاط کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ اسی انحطاط کی دست بُرد سے علوم اہلبیتؑ کی ترویج وتدریس کو محفوظ رکھنے کے لئے اس تبدیلی کی ضرورت تھی۔ خداوند حکیم کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ سید العلماء کی فراست نے اس ضرورت کی بوجہ احسن تکمیل کی۔ عہد شاہی میں بنیادیں استوار نہ کردی گئی ہوتیں تو بعد میں ایک قدم اُٹھانا بھی شاید ممکن نہ ہوسکتا۔

اس مدرسہ کے علاوہ بہت سے امورِ خیر انجام پائے جن کی تفصیل آپ سلسلہ کی اُس قسط میں انشاءاللہ تعالیٰ ملاحظہ فرمائیں گے۔ جو مدرسۂ ثریا جاہ حضرت امجد علی شاہ جنت مکان اور ان کے وزیر اعظم نواب امین الدولہ سے متعلق ہوگی۔ ان سب کو بھی جناب مفتی علامہ نے جناب سید العلماء کے ہی آثار میں شمار فرمایا ہے۔ سادات ومومنین ومستحقین کی جو انفرادی خدمتیں ہیں ان کا احصا کون کرسکتا ہے۔ لیکن یہاں پر میں نقد تجلیات مصنفۂ جناب رازؔ اجتہادی کا ایک اقتباس اس غرض سے پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں تا کہ یہ واضح ہوسکے کہ مدرسۂ سلطان المدارس کی تاریخ بنا کے سلسلہ میں میری جو رائے ہے اس کی ہمارے اسلاف کرام کے بیانات سے بھی تائید ہوتی ہے:

> ''............ایک مدرسۂ سلطان المدارس ہی شاہانِ اودھ کا وہ زریں عمل ہے جس نے علم کے دریا تمام ہندوستان کے ہر گوشے میں پھیلا دیئے...... یہ تمام آثار اس خاندان اجتہاد کے علماء کی زبردست روحانیت کا نتیجہ ہیں......''

جناب کی زہد، بے نفسی اور حسن اخلاق کی ثناء وصفت میں آپ کے مقدس وزہد پیشہ سیرت نگاروں نے بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے۔ نہ ان واقعات کی صحت وصداقت میں کوئی شک ہوسکتا ہے، نہ ان کی عظمت واہمیت میں لیکن ان سطور کے لکھنے والے کو تو مرحوم کے زہد واستغنا کی یہ حد حیرتمیں ڈالنے والی ہے کہ حکومت میں اس درجہ اثر ورسوخ اور مدخلیت ونفوذ کے باوصف اپنے یا اپنے خاندان کے لئے کوئی معافی، جاگیر، علاقہ مستاجری کچھ بھی تو حاصل نہیں کیا، دنیا کے بد دیانتوں نے طرح طرح کی چہ می گوئیاں کی ہیں لیکن کسی میں یہ کہنے کا دم نہیں کہ حکومت میں اپنے اثر کا استعمال ذاتی انتفاع کے لئے کیا ہو۔ اور نہ اس عطیہ میں جو جناب غفران مآبؒ علیہ الرحمہ کو عہد نواب آصف الدولہ بہادر میں ملا تھا کوئی اضافہ ہوا ہو۔ درآں حالیکہ افراد خاندان ومرجعیت میں اضافے کے ساتھ ضروریات بھی روز افزوں تھیں۔ یہ بھی نہیں کہ نقد میں کوئی متروکہ چھوڑا ہو۔ ۱۲۷۲ھ میں انتزاع سلطنت ہوتا ہے۔ ۱۲۷۳ھ میں جناب کی وفات حسرت آیات کا حادثۂ فاجعہ پیش آتا ہے اور ۱۲۷۶ھ آتے آتے جناب سید العلماء کی جو حالت ہوجاتی ہے اس کا ذکر ہم مفتی علامہؒ کے الفاظ میں اس طرح پاتے ہیں۔

''......بعد از نماز ووظائف خانہ سید علی نقی صاحبؒ رفتم خطوطے از عیال علّیین مآب آمدہ بمن نمودہ گریست ومراہم رقتی دست داد گفتم اکنوں مصیبت بکمال رسید وصبر فنا شد امید فرج است......دلم بر عیال جناب علیین مآب واطفال عموے خودم سوخت وحال خودم ہر چند خراب است لیکن نظر بریں خاندان جائے شکایت نیست۔

(روزنامچہ مورخہ ٦ صفر ۱۲۷٦ھ۔ بحوالہ تجلیات ص ۱۴۵)

اب اس سے بڑا شاہد جناب کی قناعت ودرویشی کا اور کیا ہوسکتا ہے۔

جناب کی جلالت علمی کے متعلق محاکمہ کیا کسی طرح کا اظہار خیال راقم السطور کی اوقات سے باہر کی بات ہے۔ اس لئے عمومی طور پر میں ان کے نکتہ سنج رتبہ شناسوں کی رائیں نقل کرنے پر اکتفا کروں گا، البتہ خصوصی طور پر بعض آرا کا جائزہ لینے کی جرأت کروں گا جو دوسرے اہل قلم نے جناب کی نسبت ظاہر کی ہیں اور میری نظر قاصر میں ان کی اساس بہت کمزور ہے۔

سب سے پہلے آپ مفتی علامہ میر عباس صاحب طاب ثراہ کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

وَكَأَنَّهُ فِي كُلٍّ مِنَ الْفُنُونِ اَفْنَى الزَّمَانَ وَالْقُرُونَ وَمَا الْتَمَتَ اِلٰى غَيْرِهٖ اَبَدًا وَلَا اصْطَحَبَ فِي سَيْرِهٖ اَحَدًا۔ (اوراق الذھب)

جناب ہر فن میں اکمل روزگار وقرون تھے ایسا کمال کسی اور کو کبھی حاصل نہیں ہوا اور اس کی سیر کوئی دوسرا جناب کا ہمرکاب نہیں ہوسکا۔

اس کے بعد خلاصۂ کلام کے طور پر فرماتے ہیں:

...وَمِنَ الدَّلِيْلِ عَلٰى غَزَارَةِ عِلْمِهٖ اَنَّهُ لَا يَزَالُ لَيَسْئَلُهُ اَهْلُ هٰذِهِ الْبِلَادِ وَيَنْفُذُوْنَ اِلَيْهِ مِنَ

الاَغْوَارِ وَالْاَنْجَارِ وَصُنُوفاً مِنَ الْمَبَاحِثِ
الْاَنِيْقَةِ وَالُوخَامِنَ الْمَسَائِلِ الدَّقِيْقَةِ فَيَجِبُ
عَنْهَا عَلَىٰ اِرْتِجَالٍ وَيَحُلُّهَا بِاسْتِعْجَالٍ فِيْ
تَوَخُّرِ الْاِتِّعَالِ وَتَوَزُّعِ مِنَ الْبَالِ حَادِيًا
لِلشُّقُوْقِ فِي كُلِّ مَسْئَلَةٍ قَاطِعاً لِلْعُرُوْقِ عَنْ
كُلِّ مُعْضَلَةٍ حَتّٰى لَوْ تَفَكَّرَ فِي مَا اَجَابَ
الْمُتَفَكِّرُونَ وَتَدَبَّرَ فِي مَا اَفَادَ الْمُتَدَبِّرُوْنَ
وَاُجِيْلَ فِيْهِ الْاِنْكَارُ وَاَفْنَى فِيْهِ الْاَعْمَارَ لَمَا
وُجِدَ اِلٰى مَا سِوَاهُ السَّبِيْلُ وَمَا قَامَ عَلٰى مَا
عَدَاهُ دَلِيْلٌ وَلَمْ يَقْوِ اَحَدٌ عَلَىٰ اِضْعَافِهٖ وَهٰذَا
دَلِيْلٌ عَلٰى كَمَالِ قُوَّةِ الْاِجْتِهَادِ بِهٖ لَوْ لَمْ يَكُنْ
اِلَّا هُوَ لَكَفٰى وَلَهُ وَرَاءَ ذٰلِكَ فَضَائِلُ اُخْرٰى
اَجَلُّ مِنْ اَنْ يَخْفٰى۔۔۔"

جناب کی غزارت علمی کی دلیل یہ بھی ہے کہ ہالی شہر ہر ایک مسائل دریافت کرتے رہتے اور بلند و پست سے نفیس مباحث کے بارے میں نیز گہرے مسائل کے بارے میں سوال کرتے رہتے اور جناب کسی غور وفکر کے بغیر ان تمام باتوں کا جواب دیتے رہتے اور یہ کثرت مشاغل وہجوم افکار کے باوصف تھا۔ اور یہ جوابات ہر مسئلے کے شقوق پر حاوی اور مشکلات مسائل کی جڑیں کاٹ دینے والے ہوتے تھے اور ان جوابات کی شان یہ ہوتی کہ اگر اہل فکر وتدبّر ان پر غور وخوض کرتے، ان پر مسلسل نظریں ڈالی جائیں اور ان کے حل کرنے میں زندگیاں بسر کردی جائیں تب بھی جناب جو افادۂ جواب فرما چکے ہوتے اس کے سوا کوئی اور راہ نہ ملتی، نہ کوئی دوسری دلیل قائم کی جاسکتی اور نہ ان جوابات پر کوئی اضافہ کسی کے بس کا ہوتا اور یہ جناب کی قوت اجتہاد کی دلیل ہے۔ اور اگر یہی ایک بات ہوتی تو جناب کی فضیلت کے لئے کافی ووافی ہوتی درآنحالیکہ اس کے علاوہ جناب کے بہت سے ایسے فضائل ہیں جن پر پردہ ڈالنا ممکن نہیں ہے۔

آپ نے مفتی علامہ کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایا لیکن ان نسبتاً طویل فقرات میں اظہار خیال یا بیان واقعہ ہوا ہے اس سے زیادہ ایک شعر میں کہہ دیا ہے پہلے مضمون میں اسے نقل کر چکا ہوں مگر قند مکرر کے طور پر پھر پیش ہے۔

امامیہ در کشور اجتہاد
چو او مادر دہر ہرگز نہ زاد

مفتی علامہ نے اپنے استاد علیہ الرحمہ کے حالات میں ایک نہیں کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں "اوراق الذھب" کو ایک خاص رتبہ حاصل ہے اور وہ جناب کے فضائل ومناقب سے مملو ہے۔ اس کی اگرچہ پھر سے اشاعت ہوجائے یا اس کا ترجمہ شائع ہوجائے تو ایک بڑی کمی پوری ہوسکتی ہے۔ اور جناب کی نسبت مفتی علامہ کے معتقدات تمام وکمال منظر عام پر آسکتے ہیں۔

اسی طرح جناب علامہ سید اعجاز حسین صاحب کنتوری طاب ثراہ "شذور العقیان" میں فرماتے ہیں:

"كَانَ فَرِيدَ عَصْرِهٖ وَنَسِيجَ عَهْدِهٖ لَمْ يَكْتَحِلْ
حَدِيْقَةَ الزَّمَانِ لَهٗ بِمِيْثَاقِهٖ وَلَمْ يَصِلْ اِلٰى رُتْبَتِهٖ
فِي زَمَانِهٖ نَظِيْرٌ وَلَا عَدِيْلٌ صَاحِبُ

التَحْقِيقَاتِ الْاَنِيقَةِ وَالتَدْقِيقَاتِ الدَّقِيقَةِ عَالِى الْكَعْبِ فِى الْفُنُونِ الْعَقْلِيَةِ وَالنَقْلِيَةِ بَارِعًا فِى الْاُصُوْلِ وَالْفِقْهِ وَالْكَلَامِ مُجْتَهِدًا خَبِيْرًا بِاَحَادِيْثِ خَيْرِ الْاَنَامِ ذِى الْقُوَةِ الْقُدْسِيَةِ وَالْمَلَكَاتِ الْمَلَكِيَةِ۔"

''جناب اپنے عصر میں فرد فرید اور اپنے عہد میں خلاصہ روزگار تھے۔ چشم دوراں کو ان کے مانند کوئی سرمہ نہیں ملا اور نہ کوئی صاحب تحقیقات وتدقیقات ان کا ہم رتبہ تھا۔ وہ فنون عقلیہ ونقلیہ میں نہایت بلند پایہ تھے، اصول وفقہ وکلام میں کامل تھے، ایسے مجتہد تھے جو احادیث خیرالانام سے پوری طرح باخبر تھے وہ صاحب قوت قدسیہ اور مَلکی ملکات کے مالک تھے۔''

صاحب حیات فردوس مکان نے دوسرے علماء کبار اعلیٰ اللہ مقامہم کے آراء مبارکہ نقل کئے ہیں جن کو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

حجۃ الاسلام آقا مرزا علی نقی طباطبائی کربلائی رحمہ اللہ کی رائے:

''آپ خاتمہ ہیں رقیمہ فقہ واجتہاد کا، اور احکام شریعت کے نظام میں اسلام کا بازو ہیں اور حجت مرد ماں ہیں۔''

بحرالعلوم ملا حسین طباطبائی نجفی کی رائے کا خلاصہ:

''اسلام ومسلمان کے شیخ واُستاد ہیں اور نشانی خدا کی ہیں، عالموں کے لئے آپ کا نہ کوئی کفو علماء سابقین میں تھا نہ آئندہ ہوگا۔ آپ معین دین اسلام اور حافظ شرع خیرالانام ہیں۔''

حجۃ الاسلام آقا شیخ محمد حسن نجفی مصنفہ جواھر الکلام کی رائے کا خلاصہ:

''آپ جملہ علوم عقلی ونقلی میں علامہ ہیں شیعوں کے مددگار اور شرع کے حامی ہیں۔''

(حیات فردوس مکان، ص ۷)

جناب کی غزارت علمی کا ذکر تمام ہوا۔ جو اقتباس لئے گئے ہیں ان سے ایک مجمل تصور جناب کی جلالت کی نسبت ہوگیا ہوگا۔ مشتاق حضرات اصل ماخذ کی طرف رجوع کرکے علم تفصیلی حاصل کرسکتے ہیں۔ اب مجھے دو صاحبان قلم کی آرا سے جو تعرض کرنا ہے جن سے قطع نظر جناب سے متعلق نظر کرنے والے کسی دیانتدار طالب علم کے لئے نازیبا ہے۔ ایک تو مرزا عزیزؔ مرحوم کی جناب مفتی علامہ کی ادبیت کے متعلق رائے ہے جس کے ذیل میں مرحوم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں:

''اگرچہ ممدوح (مفتی علامہ) حضرت سید العلماء کے گروہ تلامذہ میں داخل تھے اور اس پر ان کو فخر بھی تھا یہ کہنا سوء ادب نہ ہوگا کہ اس علم میں وہ بھی مفتی صاحب کے حاجت مند تھے'' ....

(تجلیات حصہ ا ص ۲۱۹)

پھر فرماتے ہیں:

''سید العلماء طاب ثراہ کو جو مرحلہ علمائے عراق کے خطوط کے جواب کا پیش آتا تھا اس کا

بندوبست صرف جناب مفتی صاحب کی طبع عالی اور کلک گُہر بسلک سے ہوتا تھا ورنہ فصحائے عراق اکابر مجتہدین اور عرب عربا کی تحریرات کا جواب ہندوستان سے روانہ ہونا سخت دشوار ہوتا اور اگر روانہ بھی ہوتا تو سید العلماء کی شان عالمیت کے مناسب نہ ہوتا۔۔۔۔۔''

(تجلیات، حصہ دو، ص ۱۵۰)

اور اس ادعا کے استشہاد کے طور پر فرماتے ہیں:

''......تحریر خطوط ومکاتیب میں مفتی صاحب کا طرز عمل یہ بھی تھا کہ کبھی کسی خط میں اپنے نام کا ایما واشارہ تک نہیں کیا بلکہ سلام بھی تحریر نہیں فرمایا کہ کہیں یہ نہ معلوم ہوجائے کہ یہ عبارات رنگین واشارات تمکین کسی دوسرے کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ جداگانہ خط بھی سوائے ایک دو خطوں کے علمائے عراق کے نام اس زمانہ میں اسی اندیشے سے نہیں لکھے......''

افسوس کہ ان تمام ملاحظات کی توثیق حقائق سے نہیں ہوتی۔ مولوی منے آغا صاحب رازؔ اجتہادی مرحوم نے ''نقد تجلیات'' میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ مگر مجھے اس مناقشے کی یاد تازہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ عزیزؔ مرحوم نے کما حقہٗ، داد تحقیق نہیں دی۔ کیوں کہ عطیۂ شاہی کی وجہ سے ہی جیسا کہ مرحوم کو خود اقرار ہے، جناب سید العلماء طاب ثراہ کی مراسلت علماء عراق سے رہتی تھی۔ ان میں سے صاحب جواہر الکلام، شیخ محمد حسن نجفی طاب ثراہ کی ذات قدسی منزلت وہ ہے کہ جن کی خدمت میں جناب سید العلماء نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ شاہ اودھ سے لے کر نہر آصفی پر تعمیر کے لئے بھجوایا تھا اور یہ کام آقائے نجفی کی ہی نگرانی میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ صاحب جواھر اور جناب اعلیٰ اللہ مقامہما میں کتنی خط وکتابت ہوگی۔ انھیں صاحب جواھر کے نام مفتی صاحب نے عریضہ لکھا اور اسے ''اوراق الذھب'' میں شامل کیا۔

قرینۂ عبارت کا ایما ہے کہ صاحب جواھر نے مفتی صاحب کی نسبت کوئی بات دریافت کی ہے۔ جواب میں مفتی صاحب اپنا تعارف کراتے ہیں:

''وَاِنْ کُنْتَ سَائِلاً عَنِّی فَاِنِّی... فِقْرَاتْ شَطْرًا صَالِحًا مِنْهَا علیٰ السَیِّدِ... المُحْیِ لِشَرِیْعَةِ جَدِّہِ السَیِّدِ الثَّقْلَیْنِ وَارِثِ الْاَئِمَّةِ الْمُصْطَفِیْنَ مَوْلَاسَیِّدحُسَیْن''

اگر آپ میری نسبت دریافت فرماتے ہیں تو میں مولانا سید حسین کا شاگرد ہوں......''

اس خط سے یہ دعویٰ بے حقیقت ہوجاتا ہے کہ علمائے عراق سے مفتی صاحب اپنے نام کو مستور رکھتے تھے اور وہ حضرات ان سے یا جناب سید العلماء کے شعبۂ مراسلات کے تعلق سے ناواقف تھے۔ جہاں تک حضرت سید العلماء کے کمال ادبیت کا تعلق ہے اس کے ایک باب میں خود مفتی علامہ کے اتنے بیانات موجود ہیں جن کے ہوتے ہوئے جناب عزیزؔ مرحوم کی رائے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاسکتی۔ عربی ادب وانشا کا مبحث ہو اور اس میں مفتی علامہ

کی رائے ایک طرف اور عزیزؔ مغفور کی رائے دوسری طرف ہوتو کون ہے جو عزیزؔ مرحوم کی رائے کو وزن دینے پر تیار ہو۔ اب جناب سید علامہ کی جلالت وشان ادبیت کی نسبت مفتی علامہ کی رائے ملاحظہ کریں۔

"وَاما الْعَرَبِيَّةُ وَالْاَدَبُ فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِلِسَانِ الْعَرَبِ كَلَاماً اَحْلیٰ الضَّرْبِ وَيُحَاوِرُ اِفْحَاحَهَا بِمَايَقْضِي الْعَجَبَ"

(اوراق الذہب بحوالہ ورثۃ الانبیاء ص ۱۶۶)

اور عربیت وادب کی بات یہاں تک ہے وہ ایسی بامحاورہ عربی ارشاد فرماتے تھے جیسے کہ ثقات اہل زبان بولتے ہیں جو شہد سے شیریں تر ہوتی تھی اور سننے والے ششدر رہ جاتے تھے۔

ایک محل اور ملاحظہ فرمائیں۔ جو ادب وانشاء پر سید علامہ کی قدرت کی دلیل بین ہے۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں:

"قَدْ اِتَّفَقَا فِي بَعْضِ الْجُمْعَاتِ اَنْ خَرَجَ لِلصَّلٰوةِ فَلَمَّا اَرَادَ اَنْ يَخْطُبَ فَاحْتَاجَ اِلَى اَنْ يَكْتُبَ وَقَدْ صَعَدَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَقَعَدَ وَاسْتَقَرَّ وَقَامَ الْمُؤَذِّنُ وَكَبَّرَ وَالزَّمَانُ غَيْرُ بَاقٍ اِلَّا بِقَدْرِ فُوَاقٍ فَاَنْشَاَ اِرْتِجَالاً وَاَمْلٰى اِسْتِعْجَالاً خُطْبَتَيْنِ بَلِيْغَتَيْنِ سَبْكُهَا سَبْكُ اللُّجَيْنِ۔"

(اوراق الذہب بحوالہ ورثۃ الانبیاء ص ۱۰۱)

نماز جمعہ کے سلسلہ میں یہ اتفاق پیش آیا کہ جناب نماز کے لئے تشریف لے گئے اور جب خطبہ پڑھنے کا قصد فرمایا تو کتاب موجود نہیں۔ خطبہ لکھنے کی ضرورت پڑ گئی حالت یہ تھی کہ جناب منبر پر بلند ہو کے اپنی جگہ لے چکے تھے، موذن اذان دے چکا تھا، وقت بہت تنگ رہ گیا، جناب نے برجستہ طور پر دو نہایت بلیغ خطبے بول کے لکھوا دیئے جن کا اسلوب چاندی کے ڈھلے سکّے کے مانند تھا۔

یہ احتمال ہوسکتا ہے کہ جو کچھ جناب مفتی صاحب نے اپنے علامہ کی نسبت اظہار خیال کیا ہے وہ از راہ تواضع وکسر نفل ہے۔ مگر خود عزیزؔ مرحوم نے جناب مفتی صاحب کی صدق نوازی، حق کوشی اور خلاف واقع کے اظہار سے جو احتراز کلی کی جو مثال پیش کی اس پر اگر نظر کی جائے تو معلوم ہوجائے گا کہ مومن کی خاطر یا کسی جذبۂ حسنہ سے بھی متأثر ہو کے آپ کوئی بات ایسی نہ کہتے تھے جو خلاف واقع ہو۔ اس سیرت مستمرہ کا ذکر عزیزؔ مرحوم کی لفظوں میں ہی دیکھیں:

''ایک شخص نے اپنے ہاتھ کا ایک نوشتہ پیش کیا جسے محنت سے لکھا تھا اور اپنے خیال میں خوش خط لکھا تھا۔ لیکن درحقیقت بدخط تھا اور غرض یہ تھی کہ آپ ملاحظہ فرما کر مدح کریں اور وہ مدح اس شخص کے لئے باعث سرور ہو چونکہ آپ خود بھی خوش خط تھے ملاحظہ فرما کر دیر تک خاموش رہے کہ کیا جواب دوں اگر کہتا ہوں کہ خوب لکھا ہے تو کذب اور خلاف واقع ہوتا ہے اور اگر کہتا ہوں کہ اس کا خط اچھا نہیں ہے تو یہ شخص شکستہ خاطر ہوگا۔ غور کرتے کرتے فرمایا کہ بھائی تم نے کیا عمدہ سیاہی سے لکھا جس کے دیکھنے سے آنکھوں میں نور آتا ہے۔ وہ شخص اس ارشاد سے خوش ومسرور

اور جناب کا قدم جادۂ صدق سے نہ ہٹا۔''

(تجلیات حصہ دوم ص ۸۷)

جب صورت حال یہ ہو اور یہ جناب مفتی علامہ کے زہد و ورع کے لئے ضروری بھی تھی تو کیسے مان لیا جائے کہ ادبیات میں مرحوم کو اپنے استاد کے ساتھ برتری یا کم سے کم مساوات کا احساس تھا اور وہ اپنا اور اپنے استاد کا ذکر اس مسئلہ خاص میں ان لفظوں میں کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کو خود اپنے ادبی کمالات کا احساس تھا اس کے باوجود اپنا اور اپنے استاد کا فرق ظاہر فرماتے ہیں:

''اَلَمْ یَکْفِکَ فِی الدَّلِیلِ عَبْدُہُ الْفَقِیْرُ الذَّلِیلُ وَ اَنَّہٗ کَالْمَلِکِ الْجَلِیلِ وَھُوَ اٰیَۃٌ مِنْ اٰیاتہٖ وَرَاٰیَۃٌ مِنْ رَایَاتِہٖ۔''

(منقول از نقد تجلیات ص ۴۳)

''کیا جناب سید العلماء کا یہ عبد ذلیل اور ان کی ادبیت کے ثبوت کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ میں ان کے علامات ادبیت میں سے ایک علامت اور ان کی نشانیوں میں سے ایک نشان ہوں۔''

کہاں بندگی و خواجگی کا اظہار اور کہاں برتری یا برابری کا افتخار۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَارِ

دوسرا مقام جس پر مجھے نظر کرنا ہے اور ارباب نظر کو اس کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ یہ اپنے تحقیقی مقالے میں جو ''ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں'' کے نام سے مکتبۂ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی سے شائع ہوا ہے، ڈاکٹر محمد سالم قدوائی صاحب کا جناب سید العلماء طاب ثراہ کی کتاب 'امالی التفسیر و المواعظ' کی نسبت اظہار خیال ہے۔ مگر سب سے پہلے اس بات کا اعتراف میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ ڈاکٹر قدوائی نے شیعہ مآخذ کی تلاش و تحقیق فراخدلی اور رواداری سے کی ہے، جہاں جہاں مواد فراہم ہونے کا امکان تھا، ان سب ہی کتب خانوں میں تلاش کی جو کچھ پایا اس کا نیک نیتی سے استعمال کیا۔ کتب خانہ غفران مآبؒ، کتب خانہ ناصریہ، کتب خانہ جنت مآبؒ، کتب خانہ مدرسۃ الواعظین، کتب خانہ سلطان المدارس سب ہی کو دیکھا اور فائدہ اٹھایا مجھے یقین ہے کہ اگر مناسب تعاون حاصل ہو گیا ہوتا تو موصوف وہ رائے ہرگز ظاہر نہ کرتے جس سے تعرّض میرا ناگوار فریضہ بن گیا ہے۔ کتاب کے متعلق ڈاکٹر قدوائی نے تسلیم کیا ہے کہ:

''بیشتر جگہوں سے صفحات بھی غائب ہیں جس کی وجہ سے تسلسل کے ساتھ سمجھنے اور عبارتوں سے مطلب نکالنے میں کافی مشکل ہوتی ہے۔''

پھر لکھتے ہیں:

''بہت سی جگہوں پر درمیان میں کئی کئی صفحے سادے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے بیچ کی عبارتیں چھوڑ دی ہیں یا اگر اصل مصنف کے قلم کی تحریر ہے تو ممکن ہے کہ ان کا ارادہ رہا ہو کہ بعد میں مکمل کریں گے۔ اور پھر اس کا موقع نہ مل سکا ہو۔ بہر حال عجیب کتاب ہے۔ یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ اس میں مصنف کیا کہنا چاہتا ہے اور کیا کہا ہے۔''

اس نتیجہ پر فاضل متخصص کے پہنچنے کا باعث بظاہر

یہ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے مفسر کے حالات کی امعانی جستجو میں کد نہیں کی، ورنہ موصوف کو پتہ چل جاتا کہ مفسر علامہ کا انداز تفسیر کیا تھا۔ مفتی علامہ نے اس پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ آپ کے ارشاد کا محصل یہ ہے کہ

''میں نے تو جناب ایک سورہ کی تفسیر لکھتے دیکھا ہے اس کی شان یہ تھی کہ اس میں جناب تمام متعلقہ مسائل جو صحت لغت اور اعراب سے متعلق تھے ان کا ذکر فرماتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ مسائل صوم وصلوٰۃ کا ذکر اور اہل تصوف، اخباریوں، مفوضہ، غالیوں اور اہلسنت والجماعت کے مسلک کی رد ہوتی تھی۔ طاعات کی طرف ترغیب اور قیامت سے ترہیب ہوتی تھی، ائمہ معصومینؑ کی ولادت اور وفات کا ذکر ہوتا تھا۔ یہ تفسیر نرالے انداز میں تحریر فرماتے تھے اور ان معانی متخالفہ اور فنون متغائرہ کے ربط پر روشنی ڈالتے جاتے تھے اور اس میں کوئی جز کمزور اور ناپائیدار نہیں مل سکتی۔''

اس کے علاوہ خود امالی فی التفسیر والمواعظ کے بارے میں بھی جو اظہار خیال فرمایا ہے اس سے بھی ڈاکٹر قدوائی صاحب کی رائے کی توثیق نہیں ہو۔ حاصل ارشاد یہ ہے:

''امالی التفسیر والمواعظ تفسیر جاننے والوں یا تفسیر کرنے والوں وعظ کے خواہشمندوں اور واعظوں کی بہت سودمند کتاب ہے اگرچہ کتاب ناتمام رہ گئی مگر پھر بھی بڑے فوائد کی حامل ہے۔''

صاحب ورثۃ الانبیاء نے جناب کی دوسری تفسیری تصنیفات کا ذکر بھی فرمایا ہے، جن میں تفسیر سورۂ حمد، سورۂ بقر کی کچھ آیتوں کی تفسیر، سورۂ توحید کی تفسیر، سورۂ دہر کی تفسیر آیۂ کریمہ کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی تفسیر ہے۔ مؤخر الذکر تفسیر میں امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر کا تعقب ہے، ڈاکٹر قدوائی نے ان میں سے کسی کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ اس کے دو اسباب ہوسکتے ہیں ایک تو یہ کہ یہ افادات فارسی یا اردو ادب میں نہیں ہوں، اس لئے ان کے دائرہ تحقیق سے باہر جا پڑے ہوں، دوسرے سراغ ہی نہ لگ سکا ہو کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ قدوائی نے جناب سید العلماء علیین مکانؒ کے حالات کی طرف مطلق التفات نہیں فرمایا۔ اس دوسری شق کا رجحان غالب ہونے کے اور اسباب بھی ہیں۔ ایک تو ان کتابوں کے ہونے کا سب سے زیادہ امکان کتب خانہ جنت مآب میں ہوسکتا تھا اور وہاں ان کتابوں کے ہونے نہ ہونے کی تحقیق خود ذمہ داران کتب خانہ کو نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ عربی کے علاوہ اگر کوئی کتاب دوسری زبان کی ہے تو صاحبِ ورثۃ الانبیاء نے تصریح فرمادی ہے مثلاً رسالۂ وسیلۃ النجات جو اصول کلام کے موضوع پر فارسی میں ہے۔ اس لئے جناب سید العلماء کے مجموعی حالات وخدمات تو موضوعِ تحقیق میں ہی جناب کے تفسیری کارنامے کے بجائے خود ایک عنوان بن سکتے ہیں۔

افسوس کہ یہ تحریر اب طول عمل کا شکار ہوتی جارہی ہے۔ اس لئے اولاد، تصانیف اور تلامذہ کا ذکر خیر کسی اور وقت کے لئے ملتوی کرتا ہوں۔

